ڈاکٹر علمدار حسین بخاری

اُردو شاعروں کے تذکرے اور ادبی تاریخ نگاری

Tazkara - a compilation of introduction of poets and their poetry is one of the major sources of Urdu research. Histories of Urdu literature are mostly based on facts given in these Tazkaras. The article critically discusses the process of compilation of history of Urdu literature with special reference of Tazkaras.

تاریخ تمدن انسان میں لفظ کو ہمیشہ ایک کرشمہ ساز مظہر قرار دیا گیا، لفظ اور لفظوں کی مخصوص ترتیبیں اپنی قوتِ ابلاغ اور اپنے مخصوص آہنگ کے توسط سے ہر دور کے انسان کی انفرادی اور اجتماعی شخصیتوں کی تشکیل میں ہی بنیادی حیثیت کی حامل نہیں رہیں، انہیں بعض مابعد الطبیعاتی جہتوں اور ان جانی قوتوں کا سرچشمہ بھی سمجھا جاتا رہا، لفظ قدیم دور میں مروّج تصوّرات اور فلسفوں کے مطابق بھی محض فرد ہی نہیں سماج کا ماضی الضمیر بھی بیان کرتے تھے، انہی کے توسط سے لوگ ایک دوسرے کے دلوں کے بھید پاتے اور خود اپنے دل کی بات دوسروں تک پہنچانے کے جتن کرتے تھے، انہی لفظوں کی مخصوص ترتیبوں سے جادو کے شبد اور منتر تشکیل پاتے تھے، یہی حروف اور الفاظ ایسے تعویزوں کے نقش بناتے کہ جو انسان کی روزمرہ اور عملی زندگی میں بظاہر ناممکن دکھائی دینے والی باتوں کو ممکن بنا دیتے تھے، تمام مذاہب اور عقیدے الفاظ ہی کے توسّط سے لوگوں کے ذہنوں کو مسخّر کرتے رہے کہ ہر کتابِ مقدّس، صحائف اور وید وغیرہ لفظوں ہی کی ساختیں اور تشکیلیں تھیں، ہر مذہب کے پیروکار لفظوں کی مخصوص ترتیبوں، ساختوں اور تشکیلات اور ان کے پیدا کردہ معانی پر ایمان لا کر اپنی زندگی اور آخرت کی سُرخروئی کی بشارتیں تلاش کرتے تھے، مذاہب ہی نہیں جادو ٹونے میں بھی تاثیر الفاظ کی مخصوص اور طے شدہ ترتیبوں میں دیکھی جاتی تھی اس لئے آیتوں، شبدوں اور منتروں کو عین مین اُسی حالت اور اُنہی لفظوں میں محفوظ رکھنا ضروری تھا جس حالت اور جن لفظوں میں کسی روحانی پیشوا، عامل یا جادوگر نے اپنے شاگردوں، مریدوں یا چیلوں کو تعلیم کیا ہوتا، وہی لفظ اور الفاظ کی ترتیبیں ہو بہو ویسے ہی دہرائی جاتیں تو ان سے تاثیر کے چشمے پھوٹ سکتے تھے اسی باعث انسانوں نے الفاظ اور الفاظ کی مخصوص ترتیبوں، تشکیلات اور کلام کو یاد رکھنا اور اس کا ریکارڈ رکھنا سیکھا ہوگا۔

ادب و شعر کو بھی اسی لئے کبھی جزوِ پیغمبری قرار دیا گیا تو کبھی ساحری سمجھا گیا کہ یہ لفظوں کی تشکیلات تھے اور جادو اثر آہنگ کے حامل ہوتے تھے، اشعار بھی عین مین لفظوں کی اسی ترتیب ہی میں مسحور کرتے تھے کہ جس میں شاعر نے انہیں تشکیل (compose) کیا ہوتا اس لئے شاعری کی صلاحیت کو وہبی سمجھا جاتا تھا اور اس میں بھی عموماً مابعد الطبعیاتی جہت کی جستجو کی جاتی تھی حتیٰ کہ افلاطون جیسے عقلیت پرست فلسفی نے بھی شاعری کو کسی دیوی (Muse) کے اثر کا نتیجہ قرار دے دیا۔ شاعر کے کلام کو بھی آیتوں، شبدوں اور منتروں کی طرح یاد رکھا جاتا اور بار بار دہرایا جاتا تھا اس لئے کسی انسان کے تخلیق کردہ اشعار

Scanned by CamScanner

مقدّس کلام خداوندی کے مدِ مقابل آن کھڑے ہوتے لیکن ان کے عمومی مقصد اور اثر کے فرق کی بنا پر انہیں (شاعری کو) عام طور پر مروّجہ اور مستحکم نظامِ اقدار و اخلاقیات کے خلاف خطرہ سمجھا جاتا رہا اور مروّجہ اخلاقیات کے حامیوں نے شاعری کی ہمیشہ مذمت کی اور شاعروں کو دیس نکالا دینے کے احکام صادر کرتے رہے، معاملہ محض سماجی اور مذہبی اصولوں اور معنویت سے انحراف کا نہیں تھا بلکہ مسئلہ یہ تھا کہ شعرا خود اپنے سماج میں مروّجہ اور استحکام یافتہ طرز ہائے کلام (discourses) سے ہٹ کر کلام/ڈسکورس ایسی کی مختلف اور متبادل صورتیں پیدا کرتے تھے جن سے مروّجہ اور مقتدر ڈسکورس کی تنسیخ اور انہدام کا خدشہ پیدا ہو جاتا تھا اسی لئے یہ تخلیق کار گردن زدنی قرار پاتے تھے، لیکن اس مقام پر ایسی کسی بحث میں اُلجھنے کی بجائے اس خاص بات کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ کسی سماج کے اندر رائج اور مسلمہ مقدّس کلام کی طرح شاعر کا کلام بھی سامع یا قاری کی یاداشت کا لازمی حصہ بن جاتا تھا (جس سے مقدس کلام کی بے دخلی (displacement) کا امکان پیدا ہوتا تھا کیوں کہ بعض شاعروں کا پُر تاثیر کلام کبھی کبھی مذہبی مقدس کلام کا متبادل بن جاتا تھا (سکھوں کی مقدس کتاب گورو گرنتھ اہم ترین مثال ہے) تاریخ کے سرسری مطالعے سے ہی عیاں ہو جاتا ہے کہ انسانوں نے اولاً اپنے حافظے کے ذریعے اور تحریر کی ایجاد کے بعد بذریعہ تحریر شاعری کا ریکارڈ بھی رکھنا شروع کر دیا تھا، منہ زبانی روایت (oral tradition) کی ان گنت صدیوں کے بعد لوحیں رقم کی جانے لگیں تو مقدّس فرامین کے ساتھ ساتھ شاعروں کا کلام بھی ان تحریروں میں محفوظ ہونے لگا، عراق، مصر اور شام و یونان کی گم گشتہ تہذیبوں کی باقیات اور آثار میں اس کی وافر مثالیں دریافت ہو چکی ہیں ماضی کی ان باقی ماندہ تحریروں میں بعض اوقات شاعروں کا کلام مقدّس فرامین اور مذہبی کلام میں گڈمڈ بھی ہو گیا ہے۔[1]

تمدّنِ مشرق کی معلوم صدیوں میں شعر یاد رکھنا اور اسے برمحل دہرانا تہذیب کی اہم علامت سمجھا جاتا رہا ہے، قدیم عرب کا لگ بھگ ناخواندہ معاشرہ اسی باعث خود کو صاحبِ نطق و کلام اور غیر عرب لوگوں کو عجمی (گونگے) قرار دیتا تھا، عربوں کے اس زعم کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ عرب کا زبانی (oral) کلچر، روم و ایران کے تحریری کلچر کو اپنی لسانی طاقت کے آگے ہیچ سمجھتا تھا کیونکہ تحریر خاموش اور ساکت ہوتی ہے اور منہ سے نکلا ہوا کلام زندہ اور متحرک ہوتا ہے، عربوں کا کمال یہ تھا کہ انہوں نے محض اپنے حافظے کے طفیل اپنی صدیوں کی تہذیبی اور ادبی و ثقافتی روایات کو محفوظ رکھا ہوا تھا اور پھر طلوعِ اسلام اور مملکت اسلامیہ کے قیام کے ساتھ ہی جب رسول اللہؐ نے لوح و قلم (تحریر) کی اہمیت سے اہلِ عرب کو روشناس کرایا تو عرب کی ہر روایت کو تحریروں میں محفوظ کر لینے کی کوشش کی گئی، اسی دوران میں ایّامِ جاہلیہ اور بعد کی عُرب شعری اور ادبی روایات بھی تحریری فصیلوں میں آ کر محفوظ ہو گئیں، تحریری ریکارڈ میں عرب اہلِ علم نے قبل از اسلام اور بعد از اسلام کی روایاتِ ادب و شعر کو محفوظ کرتے ہوئے ان میں کوئی امتیاز نہیں برتا اس طرح مشرق میں شعر و ادب کی روایت کا باقاعدہ ریکارڈ رکھنے میں اوّلیت کا سہرا اہلِ عرب کے سر بندھتا ہے، عرب میں شاعری کی اصل اور اس کے نظامِ عروض اور شعرا کے تذکروں پر تصانیف وجود میں آئیں، بعد ازاں شعرائے عرب کے تذکروں کے تتبع میں فارسی میں بھی شعراء کے تذکروں کا رواج ہوا ایک اہم ایرانی محقق مظاہر مصفا نے ایک قدیم فارسی تذکرۂ شعرا 'مجمع الفصحا' کے مقدمے میں یہ اقرار کیا کہ اب تک کی معلومات کے مطابق پہلے تذکرۂ شعرائے فارسی 'لباب الالباب' کی تکمیل (۶۱۸ھ) سے قبل فارسی میں ایسے تذکروں کی کوئی روایت نہیں تھی البتہ عربی زبان میں شعراء کے تذکروں کی روایت موجود تھی، اُس کے اپنے لفظوں میں:

"پس از اسلام نیز تا آغاز سده ششم کتاب وریس زمینه" که ترجمه شاعران فارسی زبان را، به زبان فارسی و به استقلال در برداشته باشد نمی شناسم اما به زبان عربی کتا بهائے در ترجمه مردانِ بزرگ علم و ادب و شعر فراهم می آمده مانند کتاب یتیمة الدهر ثعالبی که ابو القاسم

Scanned by CamScanner

علی پسر باخرزی متوفا بسال ۴۶۷ھ دہلی بنام دمیۃ القصر و عصرۃ اہل العصر برآں نوشت به ترجمه شاعرانِ حجاز و شام ....عراق و رے...'' ۲

فارسی کے اس اوّلیں تذکرے لباب الالباب (از محمد عوفی) کے بعد نہ صرف فارسی شاعروں کے بارے میں تذکرہ نویسی کی ایک باقاعدہ روایت کا آغاز ہوا بلکہ یہی تذکرہ بعد کے تذکروں کے لئے ایک ایسا نمونہ بھی ثابت ہوا کہ اگلی کئی صدیوں تک تذکرہ نگاری کا یہی انداز چلتا رہا یہ تذکرہ دو جلدوں پر مشتمل ہے جن کے ابواب کی تفصیل ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق اس طرح ہے:

''اول در فضلیت شعر و شاعری

دوم در معنی شعر از طریق لغت

سوم در معنی آنکہ اوّل شعر کہ گفت

چہارم در معنی آنکہ اوّل کسے شعر پارسی گفت

پنجم در لطائف اشعارِ وزرائے عالی رتبت وصدورِ سامی منزلت

ہفتم در ذکر صدور و علما و ائمہ وفضلا

ہشتم در ذکر لطایف اشعارِ شعرائے کہ در عہدِ آلِ لیث وآلِ طاہر وآلِ سامان بودند

نہم در ذکر شعرائے آل ناصر

دہم در ذکر لطائف شعرائے آل سلجوق

یازدہم در ذکر لطائفِ شعرائے کہ دریں قرن بودہ اند، بعد از عہد دوست معزی و سنجری

در ذکر لطائف اشعار صدر درِ فاضل کہ بدیں حضرت مخصوص اند و بریں دولت موسوم ۳

تذکرہ لباب الالباب کے ابواب کے عنوانات ہی سے عیاں ہو جاتا ہے کہ اس میں شاعری کے بنیادی اصولوں کی تفہیم و توضیح کے علاوہ فارسی شاعری کے آغاز وارتقاء کو سمجھنے کی کوشش بھی کی گئی ہے، باب سوم سے لے کر باب دہم تک فارسی شاعری کے آغاز سے تذکرہ نگار کے خود اپنے دور تک فارسی شعراء کے حالات اور کلام کو محفوظ کیا گیا ہے، اس تذکرے میں شاعرون کے کلام کا بالترتیب مطالعہ کرنے سے آغاز سے تذکرے کی تحریر کے عہد تک فارسی شاعری کے ارتقائی مراحل کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے، اس تفہیم کے لئے محض قاری کے اندر ہی تاریخی شعور کافی نہیں بلکہ تذکرہ نگار بھی خود اپنے عہد کے مطابق تاریخ میں ہونے کے شعور سے لیس تھا، بعد کے تذکرہ نگاروں کو بھی ہم اس تاریخی شعور سے یکسر عاری قرار نہیں دے سکتے۔

ایران میں فارسی تذکرہ نگاری کی روایت کئی صدیوں پر محیط ہے ہندوستان میں فارسی شعرا کے تذکرے اسی روایت کی توسیع تھے، لیکن یہاں ان تذکروں کا تذکرہ مقصود نہیں بلکہ اُردو شاعری کے تذکروں پر بات ہوگی، اُردو تذکرہ نگاری کا رواج اُردو شاعری کے اولین سنہری دور یعنی میرؔ وسوداؔ کے دور سے ہوا کیوں کہ جب اُردو شاعری کو فارسی شاعری کے روبرو قدر و منزلت ملی تو اس کا باقاعدہ ریکارڈ رکھنے کی بھی ضرورت محسوس ہوئی اگر چہ اہل ذوق اپنی پسند کے اشعار کی بیاضیں عام طور پر رکھا کرتے تھے لیکن تذکرہ نگاری کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اب تک کی تحقیق کے مطابق اُردو شاعری کا پہلا تذکرہ اُردو کے خود اپنے دور ہی نہیں ہر دور کے اہم ترین شاعر میر تقی میرؔ نے لکھا، میر کا نکات الشعراء مولفہ ۱۱۶۵ھ ۴ اُردو کا محض پہلا تذکرہ ہی نہیں چند اہم ترین اُردو تذکروں میں سے ہے اس کے بعد نکات الشعراء کے ردِ عمل اور اس کی حمایت میں تذکرہ نگاری کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا؛ اردو شاعری کے اکثر تذکرے فارسی زبان میں لکھے گئے کیوں کہ اس دور کی علمی زبان فارسی ہی تھی، اگر چہ جدید دور کے کئی اہم نقادوں نے ان تذکروں میں یکسانیت کا شکوہ کیا ہے اس سلسلے میں انتہا پسندانہ رائے

Scanned by CamScanner

یوں بھی ہے کہ اُردو شاعری کے تذکروں میں

''.....لفاظی ہے، عبارت آرائی ہے لیکن کوئی ٹھوس بات نہیں، تذکروں کا تمام نقص یہی ہے، ہر جگہ لفظوں کا سیلاب ہے، ان لفظوں سے کوئی خاص باتیں دماغ پر نقش نہیں ہوتیں، ہر نقش، نقش بر آب کی طرح جلد مٹ جاتا ہے، کبھی یہ عبارت آرائی مضحکہ خیز (حد) تک پہنچ جاتی ہے اور طبیعت منغض ہو جاتی ہے'' ۵

لیکن ان تذکروں کے دیگر کئی قدر شناسوں نے ان میں تحقیق وتنقید کے کئی اہم رموز کو اُجاگر کیا ہے، ان کے خیال میں یہ تذکرے الفاظ و بیان کی تکرارِ محض کی بجائے اپنے اندر تنوع رکھتے تھے اس لئے ان کے خیال میں

''تذکروں کو مختلف خصوصیات کے اعتبار سے مندرجہ ذیل اقسام میں منقسم کر سکتے ہیں:

اول: وہ تذکرے جن میں صرف اعلیٰ شاعروں کے مستند حالات جمع کئے گئے ہیں اور ضمناً کلام کا انتخاب بھی دیا ہے۔

دوم: وہ تذکرے جن میں تمام قابل ذکر شعرا کو جگہ دی گئی ہے اور مصنف کا مقصد تمام شعرا کے کلام کا عمدہ اور مفصل ترین انتخاب پیش کرنا ہے اور حالات کے جمع کرنے کی طرف زیادہ اعتنا نہیں؛ بیاضیں اور مجموعے اسی صنف میں شامل ہیں۔

چہارم: وہ تذکرے جن میں اُردو شاعری کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے اور تذکرے کا مقصد شاعری کا ارتقاد کھانا ہے۔

پنجم: وہ تذکرے جو شاعری کے ایک مخصوص دور سے بحث کرتے ہیں۔

ششم: وہ تذکرے جو کسی وطنی یا ادبی گروہ کے نمائندے ہیں۔

ہفتم: وہ تذکرے جن کا مقصد محض تنقیدِ سخن اور اصلاحِ سخن ہے۔'' ۶

یہ بات تو تاریخی طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ اُردو میں شعراء کی تذکرہ نگاری فارسی تذکروں کے زیر اثر شروع ہوئی لیکن معاملہ محض تقلید ہی کا نہیں تھا تذکرہ نگاری کی دیگر گئی وجوہ بھی تھیں، ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے اُردو شعراء کی تذکرہ نگاری پر تحقیق کرتے ہوئے تذکرہ نگاری کی وجوہ پر سیر حاصل بحث کی ہے، اُن کے مطابق تذکرہ نگاری اپنے عہد کی بعض ضرورتوں کے پیش نظر شروع ہوئی، اس دور کی ایک مجبوری یہ بھی کہ ابھی چھاپہ خانہ ایجاد نہیں ہوا تھا اس لئے انسانی ہاتھ کی تحریر ہی یادداشت کے لئے ریکارڈ رکھنے کا اہم ذریعہ تھی ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مطابق تذکرہ نگاری کی اہم وجوہ یہ تھیں۔

''۱۔ اپنی یادگار چھوڑنے کا فطری جذبہ؛

۲۔ بیاض نگاری اور انتخاب اشعار کا شوق؛ تہذیبِ مشرق کے اس دور میں بیاض رکھنا اہل علم میں تہذیب کی علامت سمجھا جاتا ہے، ان بیاضوں میں ہمہ قسم معلومات درج کر لی جاتی تھیں جن سے بوقتِ ضرورت استفادہ کیا جاتا، انہی بیاضوں میں اپنی پسند کے اشعار بھی درج کئے جاتے تھے، بعض اہلِ ذوق کی بیاضوں میں اشعار بنیادی اہمیت حاصل کر لیتے تھے، ان میں شعراء کے بارے میں بھی بعض معلومات لکھ لی جاتیں۔

۳۔ شعرا کی معاصرانہ چشمک؛ تذکرہ نگاری کو ترقی دینے میں شعرا کی معاصرانہ چشمک، باہمی رقابت، گروہ بندی اور علاقائی متعصب کو بھی بڑا دخل تھا، کیوں کہ بعض شعراء خود کو اور اپنے احباب کو نمایاں کرنے اور دوسروں کو نیچا دکھانے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔

۴۔ مشاعروں کا رواج؛ اٹھارہویں اور انیسویں صدی عیسوی کے ہندوستان میں شاعری تہذیب وشائستگی کی اہم ترین علامت بن گئی تھی اور مشاعرہ ایک اہم ترین ثقافتی ادارہ تھا، ان مشاعروں میں پڑھے جانے

Scanned by CamScanner

والے اشعار زبان زد خواص و عام ہوتے تھے اور انہیں بیاضوں میں لکھ لیا جاتا تھا'' ے

فارسی اور پھر اُردو تذکرہ نگاری کے بارے میں عمومی رائے یہی رہی ہے کہ اسے بطور فن نہیں اپنایا گیا کیوں کہ اس میں فنی اصولوں کے مطابق مطلوبہ منصوبہ بندی کا فقدان ہے، تذکرہ نگار خود اپنی یا پھر اپنے ممدوحین کی شہرت کیلئے قلم اُٹھاتا تھا اور حروفِ تہجی کے اعتبار سے شعرا کے بارے میں معلومات درج کرتا چلا جاتا لیکن تذکروں کے بغور مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ تذکرہ نگاری کی وجوہ کوئی بھی رہی ہوں اور تذکرے نے چاہے کتنی شکلیں اختیار کی ہوں ایسا بھی نہیں تھا کہ تذکرہ نگار کے ذہن میں تذکرے کے کوئی واضح خدوخال نہ رہے ہوں اگرچہ اُردو تذکرہ نگاری کے اہم ترین محقق ڈاکٹر فرمان فتح پوری بھی تذکرہ نگاروں کے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ؛

> ''اب رہ گیا ''تذکرہ'' اور تذکرہ نگاری کی معنوی وسعت اور حدود کے تعین کا سوال، تو اس سلسلے میں اُردو اور فارسی کے سارے تذکرہ نگار خاموش ہیں، ہر تذکرہ نگار نے اپنے پیش رو تذکرہ نگاروں سے فائدہ بھی اُٹھایا ہے اور ان کے تذکروں میں کیڑے بھی نکالے ہیں لیکن کسی تذکرہ نگار نے یہ نہیں لکھا ہے کہ تذکرہ دراصل ہے کیا اور اسے کیا ہونا چاہیے؟'' ۸

لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر تذکرہ نگاری کی ہیئت اور معنویت کے بارے میں تذکرہ نگاروں کے ذہن واضح نہیں تھے تو وہ آخر کس معیار کے تحت دوسروں کے تذکروں میں کیڑے نکالتے تھے؟ اور پھر خود اپنے تذکرے کو منفرد اور قابلِ توجہ بنانے کیلئے کیا منصوبہ بناتے تھے؟ یہ تو صحیح ہے کہ اکثر تذکرہ نگاروں نے تذکرے کی واضح تعریف متعین کر کے اس کی بنیادی خصوصیات کی وضاحت نہیں کی لیکن ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مذکورہ مؤقف کی تردید خود انہی کے اپنے منتخب کردہ ایک اقتباس کے حوالے سے ہو جاتی ہے انیسویں صدی عیسوی کے ایک اہم تذکرہ نگار مولوی کریم الدین مؤلف تذکرہ ''طبقاتِ شعرائے ہند'' مطبوعہ ۱۸۴۸ء نے ''تاریخ و تذکرہ کا فرق اس طور پر واضح کیا ہے؛

> ''کتب تذکرہ اور طبقات چونکہ شاخیں تاریخ کی ہیں اس لیے اکثر اہل علم و فضل نے بہ لحاظ تکمیل فن تواریخ کے اس فن کی کتابیں.... تصنیف کی ہیں.... مگر افسوس کہ کسی نے اس کو شاخِ تاریخ نہ کہا۔ واضح ہو کہ تاریخ اس کو کہتے ہیں جس میں واقعات یا حالاتِ زمانہ اس طور پر لکھے جائیں کہ اس سے یہ معلوم ہو سکے کہ فلاں زمانے میں یہ حادثہ یا واقعہ گزرا، بخلاف تذکرہ کے کہ اس میں ایک خاص قسم کے لوگوں کا حال لکھا جاتا ہے۔ مثلاً تذکرۃ الشعراء یا تذکرۂ انبیاء یا تذکرۂ اولیا وغیرہ۔ اس سے معلوم ہوا کہ تذکرہ خاص ہے اور تاریخ عام کہ وہ تذکروں کو بھی مشتمل ہوتی ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ تذکرہ ایک قسم کی تاریخ ہے بشرطیکہ اس میں ہر ایک شخص کے زمانے کا بھی حوالہ ہو اور اگر صرف حال ہو اور تاریخ کسی کی دریافت نہ ہو سکتی ہو اور نہ مصنف کے بیان سے واضح ہو کہ کس زمانے کا یہ حال بیان کرتا ہے تو اس صورت میں داخل تاریخ نہ ہوگا، بلکہ ایک قسم علیحدہ مقابل تاریخ کے ہوگی۔ اس صورت میں نسبت تضاد کی ہوگی۔ غرض کہ تاریخ میں بحث واقعاتِ زمانہ سے ہوتی ہے اور تذکرے میں اشخاص کا بیان ہوتا ہے'' ۹

تذکرے اور طبقات کو تاریخ کی شاخیں قرار دینے سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان سے وہ تقاضے تو کیے ہی جائیں گے جو تاریخ کے لئے ضروری ہیں؛ اُردو شعراء کے بعض تذکروں کو خود ان کے مصنفین نے طبقات کا نام بھی دیا ہے مثلاً طبقاتِ شعراء از محمد قدرت اللہ شوق (۱۷۷۵)، ''طبقاتِ سخن'' مؤلفہ شیخ غلام محی الدین (۱۸۰۸ء) اور ''طبقات الشعرائے ہند'' مولفہ مولوی کریم الدین (۱۸۴۷ء) وغیرہ تذکرہ اور تاریخ میں فرق یہ بیان کیا گیا کہ تاریخ میں حالات و واقعاتِ زمانہ کا عمومی احوال بیان ہوتا ہے اور ''تذکرہ میں ایک خاص قسم کے لوگوں کا حال لکھا جاتا ہے'' لیکن مولوی کریم الدین نے تذکرہ کے

Scanned by CamScanner

بارے میں یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اگر کسی تذکرے میں تاریخ کو اہمیت نہ دی گئی ہو اور اس میں مذکورہ شخص کے زمانے کا احوال معلوم نہ ہو تو اسے تاریخ کا مرتبہ حاصل نہیں ہوگا؛

''کریم الدین کی طرف سے تذکرہ کی پیش کردہ اس تعریف اور تذکرے کو تاریخ کی ایک شاخ قرار دینے سے معاملہ حل نہیں ہو جاتا اس لئے فن تذکرہ نگاری کے نقادوں نے تذکرہ سے تاریخ نگاری کے اصولوں کی پاسداری کا تقاضا کرتے ہوئے ان میں کئی عمومی خامیوں کا ذکر کیا ہے جن میں خود شاعر کی پیدائش اور وفات کی تاریخوں اور دیگر نجی حالات کے علاوہ اس کے زمانے کے حالات سے بھی اغماض برتنا بنیادی حیثیت رکھتی ہیں علاوہ ازیں ان تذکروں میں ایک شاعر کے اشعار کا کسی دوسرے سے منسوب کر دینا شاعری پر تنقید میں جانبداری کے ساتھ ساتھ روایتی انداز میں محض صنائع بدائع لفظی و معنوی کے بارے میں چند اشارات اور شعری قدر و قیمت کے بارے میں مبہم آرا دینے کا بھی گلہ کیا گیا ہے'' ۱۰

اس لئے تذکروں کو تاریخ تسلیم کرنے سے بھی اکثر محققین احتراز کرتے دکھائی دیتے ہیں اور عموماً وہ اس طرح کے صاف اور واضح بیان دیتے نظر آتے ہیں کہ:

''فن تاریخ کا جس کو معمولی سا بھی علم ہے وہ جانتا ہے کہ تاریخ میں ترتیبِ زماں کی اہمیت ہوتی ہے لیکن تذکروں میں عموماً حروفِ تہجی کے اعتبار سے شعراء کا ذکر ہوتا ہے اور ایک حرف کے تحت مختلف دور کے شعراء ایک جگہ کسی تاریخی ترتیب کے بغیر اکھٹے کر دیئے جاتے ہیں.... شاعروں کا تعارف بھی تشنہ اور غیر تسلی بخش ہوتا ہے ان کی زندگی کے اہم واقعات تک سے بے اعتنائی برتی جاتی ہے'' ۱۱

کریم الدین کے سامنے خاص طور پر گارسیں دتاسی کی کتاب ''ہندوستانی ادب کی تاریخ'' تھی جس سے انھوں نے فیلن کی مشارکت میں بھرپور استفادہ کیا اور خود اپنی اُپج سے کام لیتے ہوئے اس میں کافی ترامیم اور اضافے بھی کئے لیکن کریم الدین کے لئے مسئلہ محض یہ نہیں تھا کہ وہ مغربی تحقیق و تنقید کے اصولوں سے کما حقہ، واقفیت نہیں رکھتے تھے بلکہ خود گارسیں دتاسی اپنی خواہش کے باوجود اور اپنی تصنیف کے نام کی مناسبت سے ہندوستانی ادب کی باقاعدہ تاریخ تالیف نہیں کر سکے اور تین جلدوں پر مشتمل اپنی اس کتاب (پہلی جلد مطبوعہ ۱۸۳۹ء) میں تذکرہ نگاری کے 'مشرقی رجحان' سے کچھ زیادہ آگے نہیں بڑھ سکے حالاں کہ ایسا بھی نہیں ہے کہ دتاسی جیسا فرانسیسی عالم اپنے عہد کے تصورات تاریخ نگار سے واقف نہ ہو لیکن اس باعث یہ کہا گیا کہ:

''اسی طرح اس تذکرے کی ترتیب بھی مصنف کی خواہش کے خلاف بہ اعتبارِ حروف تہجی ہے'' ۱۲

لگ بھگ تین ہزار اہم اور غیر اہم شاعروں کے نام اور نمونہ ہائے کلام دتاسی کے اس تذکرے میں محفوظ ہو گئے ہیں 'تاریخ ادب ہندستانی' میں دتاسی نے ایک اور اہم کام کیا ہے جو بعد میں ادبی تاریخ نگاری کے لئے بنیاد فراہم کرتا ہے اور وہ یہ کہ اُس نے:

''شعراء کی مروجہ اصنافِ نظم و نثر، ان کے اجزا اور اصطلاحی الفاظ کی تعریفیں بھی متعین کرنے کی کوشش کی ہے اس کوشش میں ان سے بعض جگہ لغزشیں بھی ہوئی ہیں پھر بھی یہ کیا کم ہے کہ اُنھوں نے اپنے مقدمے میں بند، ہیئت، بیاض، قصیدہ، قوالی، چیستان، دیوان، کلیات، فرد، غزل، ہزلیات، انشاء، خیال، شعر، مدح، منقبت، ساقی نامہ، سرود، شکارنامہ، سوز، تقریظ، ترانہ، تاریخ، تشبیب، تذکرہ، تضمین، واسوخت، زٹلیات، ہجو، حمد اور ریختی سب کی تعریفیں کی ہیں، یہ ایک ایسی علمی و ادبی کوشش ہے جو اس سے پہلے کسی اور تذکرے یا تالیف میں

Scanned by CamScanner

نظر نہیں آتی''۔[۱۳]

اصناف ادب کے بارے میں بات کرتے ہوئے یہ بات لائق توجہ ہے کہ کوئی ادبی صنف اچانک نہیں بن جاتی بلکہ یہ کسی ادبی روایت کا حصہ ہوتی ہے اور ایک دورِ زماں میں ادیبوں اور ان کے قارئین کے مابین ایک مسلسل تعلق اور قرأت کی روایت کے نتیجے میں اپنی شناخت حاصل کرتی ہے، ادبی صنف کی شناخت کے تعین کے اس سلسلہ عمل میں ایک مخصوص دور یا مربوط ادوار میں تخلیق ہونے والے متون (texts) کی معروضی شکلیں/صورتیں اپنی اپنی تاریخ کی حامل ہوتی ہیں، پھر اس دور کا اپنا ایک نظامِ جمالیات ہوتا ہے، لسانی تشکیلات کے تاریخی امکانات بھی ہوتے ہیں جن کے تناظر میں ان اصنافِ ادب کو قبولیت عامہ حاصل ہوتی ہے؛ ''روایتی نظامِ اصناف سخن ___ مثلاً المیہ اور طربیہ یا غنائیہ/رزمیہ/ڈرامہ ___ جو ابتدائی سماجی ہیئت پذیریوں میں خود اپنی معروضیت (خارجی شکل وصورت) رکھتے ہیں اور ایک ہیئتی ماحول اور تاریخی صورتِ حال بناتے ہیں جن میں کہ انفرادی فن پارے نے اُبھرنا ہوتا ہے اور جس کے سامنے اُس نے خود اپنی تعریف متعین کرنا ہوتی ہے''۔ [۱۴]

فارسی اور اُردو شاعری میں کئی روایتی اصنافِ ادب جس تشکیلی عمل سے گزری ہیں اس کے مطالعے اور تجزیے کے بعد ہی ان اصناف کی تفہیم ممکن ہے مثلاً غزل کو لیجئے؛ اس کے بارے میں کہا گیا کہ یہ ابتداً قصیدے کی تشبیب سے نکلی؛ قصیدہ ایک قدیم بزمیہ صنفِ سخن ہے گیا کیوں کہ قصیدہ بادشاہوں اور امراء کے درباروں میں پڑھا/سنایا جاتا تھا، قصیدے کی ابتدائی اشعار میں دربار/بزم کے حاضرین کی توجہ حاصل کرنے کے لئے حسن وعشق کے مضامین پر مشتمل اشعار کہے جاتے تھے اس باعث یہ اشعار جنھیں قصیدے کی تشبیب کہا جاتا تھا وقت گزرنے کے ساتھ ایک الگ صنف (غزل) قرار پائے؛ آنے والے وقت نے بتایا کہ قصیدہ متروک ہوا کہ دربار باقی نہ رہے لیکن غزل زندہ رہی۔ غزل کے اشعار اپنی تمام تر دروں بینی اور انفرادی باطنی تجربوں کے اظہار کے باوجود اپنی بزمیہ حیثیت سے بھی محروم نہیں ہوئے، غزل آج بھی مشاعرے کی اہم ترین صنف ہے اور غزل کے اشعار ہی محفلوں میں برمحل سنائے جاتے ہیں؛ فیضؔ، فراقؔ، ناصرؔ اور فرازؔ اور دیگر جدید تر شاعروں کے ہاں آشوبِ عصر کے سارے حوالے اگر ابھی تک ایک مخصوص روایتی زبان اور استعارے کی پابندی ملتی ہے تو یہ غزل کی ایسی تاریخ اور مستحکم روایت کے باعث ہے، غزل کا انفرادی تجربہ اسی لئے ایک معاشرے کے اجتماعی تجربے کا اظہار بن جاتا ہے، مشاہدۂ حق کی گفتگو بادہ وساغر کے حوالوں سے کہنے کے سلیقے کا ادراک محض غالبؔ ہی کو نہیں تھا ہر دور کے شاعر اور نقاد کو اس سلیقے کو اختیار کرنا پڑتا ہے اور یہی بات غزل کی معنوی جہتوں کو وسیع تر کرتی رہی ہے، ہم عصر تنقید میں اسی سے شعری/تخلیقی تصور وادراک کے تنوع کو تحریک دینے کا موقع ملتا ہے اور

> "On such accasions, even if the critic "classes" the text as a whole in this or that traditional genus, as a romance, say, rather than a comedy, the thrust of such a decision is to define the specificty of this text and mode against the other genre, now grasped in dilectical opposition to it". [۱۵]

قصیدہ اور غزل اور رومانس (romance) اور کامیڈی وغیرہ کی پہچان ایک دوسرے کے حوالے سے ہوتی ہے، اصناف کے مابین تقابل کا عمل تاریخی حوالوں کے بغیر ممکن نہیں گارسیں دتاسی کی مذکورہ تصنیف کئی اعتبار سے بجا طور پر اوّلیت کی حامل ہے اُردو میں رائج اصناف سخن کا تعین اور ان کی وضاحت اُردو ادب کی تشکیل میں کارفرما تاریخی عمل کی شناخت کا اہم ترین مرحلہ بھی ہے اس کے باوجود یہ اعتراف ضروری ہے کہ مولوی کریم الدین کے تذکرہ طبقاتِ شعرائے ہند میں پہلی بار باقاعدہ طور پر ایک تاریخی شعور کا اظہار ہوا جو بعد میں تاریخی اور سماجی شعور کے حامل دیگر تذکروں اور تالیفات کا پیش خیمہ ثابت ہوا شیم

Scanned by CamScanner

سخن مولفہ عبدالحی صفابدایونی (۷۳-۱۸۷۲ء) اور بعد میں آبِ حیات، از محمد حسین آزاد (۱۸۸۰ء) اس روایت کی توسیعات ہیں، گارسیں دتاسی سے اخذ وقبول کے باوجود:

''...کریم الدین نے اس (طبقاتِ شعرائے ہند) کو ایک نئی ترتیب اور نیا رنگ دینے کی کوشش کی ہے، ہم دتاسی کی تصنیف کو بجا طور پر بیاگرفیکل ڈکشنری کہہ سکتے ہیں لیکن تذکرہ کریم الدین اُردو شاعری کی باقاعدہ تدوین کا پہلا قدم ہے، اس کی ترتیب نیم تاریخی ہے اور مصنف کی کوشش یہ معلوم ہوتی ہے کہ شاعری کے ساتھ ساتھ اُردو ادب کا سارا دائرہ عمل زیر بحث آئے'' [۱۶]

اس سلسلے میں اُردو شاعری کے پہلے تذکرے (اب تک کی تحقیق کے مطابق) 'نکات الشعراء' کا مختصر جائزہ ناموزوں نہ ہوگا، اُردو کے اہم ترین شاعر میر محمد تقی میر نے یہ تذکرہ ۱۱۶۵-۱۱۶۸ھ میں مکمل کیا، اس تذکرے پر جانب داری، عیب جوئی و نقطہ چینی، عدم توازن، بے جا اختصار، بے ربطی اور بے ترتیبی کے الزامات عائد ہوئے؛ اس میں تذکرہ نگاری کے کئی مسلمہ اصولوں کو بھی نظر انداز کیا گیا مثلاً

''انہوں نے نہ تو شعراء کی تقسیم طبقات کے لحاظ سے کی ہے اور نہ ان کا ذکر حروفِ تہجی یا حروفِ ابجد کی ترتیب سے کیا، شعرائے دکن کا ذکر یکا یک ایک مختصر سی تمہید کے ساتھ وسطِ کتاب میں آجاتا ہے اور پھر اس کے بعد کسی تمہید کے بغیر شمالی ہند کے شعراء جگہ پاتے ہیں'' [۱۷]

لیکن اس کے باوجود ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ میر کا تذکرہ 'نکات الشعراء' تاریخی شعور سے یکسر عاری ہے اور میر کو گزرتے وقت کا کوئی احساس نہیں، اس تذکرے کی ابتداء/ مقدمہ مصنف سے یہ اقتباس دیکھئے

''پوشیدہ نماند کہ در فن ریختہ کہ شعریست بطور شعر فارسی بزبان اُردوئے معلّٰی شاہ جہاں آباد دہلی، کتابے تا حال تصنیف نہ شدہ کہ احوال شاعرانِ ایں فن بصفحۂ روزگار نماند، بناءً علیہ ایں تذکرہ مسمّٰی بہ نکات الشعراء است، نگارشتہ می شود'' [۱۸]

اس مختصر اقتباس ہی سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مصنف میر تقی میر اس بات کا احساس ہے کہ

۱۔ فنِ ریختہ (اردو شاعری) کا آغاز بزبانِ اُردوئے معلّٰی شاہ جہاں آباد دہلی، فارسی کے زیر اثر ہوا، فنِ ریختہ کی توضیح میر نے تذکرے کے آخر میں 'خاتمہ' میں کی ہے۔

۲۔ اُردو شاعری ایک عرصہ سے ہو رہی ہے اور اب ایک فن کا درجہ اختیار کر چکی جس کا تذکرہ لکھا جانا ضروری ہے جو اب تک نہیں لکھا گیا۔

۳۔ تذکرے کی تصنیف اس لئے ضروری ہے کہ اس فن کے شاعروں کے احوال صفحۂ روزگار پر باقی رہ جائیں۔

۴۔ میر تقی میر کو اس بات کا بھی احساس ہے کہ وہ اپنے تذکرے میں شمالی ہند کے اُردو شاعروں (اور خصوصاً اپنے ہم عصروں کو زیادہ اہمیت دے رہے ہیں اور دکن کے شاعروں کو ایک حد تک نظر انداز کر رہے ہیں'' اگرچہ ریختہ از دکن است'' [۱۹]

انہیں دکنی شاعری کی تاریخی حیثیت کا پورا احساس ہے لیکن میر کے خیال میں زیادہ تر دکنی شاعروں کا فنی مقام ومرتبہ ایسا نہیں کہ وہ تذکرے میں جگہ پا سکیں لیکن میر نے ولی دکنی، سراج اورنگ آبادی اور عزلت وغیرہ (غیر دہلوی شعراء) کی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیا، ولی کی شاہ سعد اللہ گلشن سے ملاقات اور شاہ صاحب کی نصیحت کا ذکر بھی میر کے ہاں ملتا ہے، یہی نصیحت شاید اُردو شاعری کو ایک اہم موڑ دینے کا سبب بنی اور ولی نے دہلوی روزمرہ محاورہ اختیار کیا میر لکھتے ہیں کہ ولی

Scanned by CamScanner

''بخدمت میاں (شاہ) گلشن صاحب رفتہ و از اشعار خود پارۂ خواند میاں صاحب فرمود (کہ) ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار افتادہ اند، در ریختہ (بائے) خود بکار ببر از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت (و تحسین و توصیف فرمودندم)''۔ ۳۹

میر نے جہاں جہاں ماضی کے شعرا کا ذکر کیا ہے یا دلی کے باہر کے شاعروں کا ذکر آیا ہے وہاں کسی نہ کسی قرینے سے ان باتوں کی وضاحت بھی ہوگئی ہے، علاوہ ازیں وہ اساتذۂ فن جو دراصل فارسی کے اساتذۂ فن تھے اور انہوں نے کبھی محض تفننِ طبع کے لئے چند شعر ریختہ کے کہے میر نے عموماً اس کی بھی وضاحت کر دی ہے، مرزا عبدالقادر بیدلؔ، سراج الدین علی خاں آرزوؔ، مرزا مظہر جانِ جاناں، شاہ ولی اللہ واشتیاق، قزلباش خاں اُمید، مرزا گرامی، میاں شرف الدین مضمون، عطا، جعفر زٹلی، حشمت، ولی، عزلت، عاجز، سعدی دکنی، ضیا وغیرہ کے تراجم میں ان باتوں کی طرف واضح اشارے موجود ہیں نکات الشعراء کے خاتمہ میں میر نے خود اپنے دور میں اُردو شاعری کے انداز و اسلوب پر انتہائی مختصر لیکن جامع تبصرہ کیا ہے۔

''بدانکہ ریختہ بر چندیں قسم است، از انجملہ آنچہ معلوم فقیر است نوشتہ می آید۔
اول آنکہ یک مصرعش فارسی و یک ہندی چنانچہ قطعہ (از) حضرت امیر (خسرو) علیہ الرحمۃ نوشتہ شد۔ دوئم آنکہ نصف مصرعش ہندی و نصف (دیگرش) فارسی چنانچہ شعر میر معز (موسوی مرقوم) کہ نوشتہ آمد۔ سیوم آنکہ حرف و فعل فارسی بکار می برند وایں قبیح است۔ چہارم آنکہ ترکیبات فارسی می آرند اکثر ترکیب کہ مناسب زبان ریختہ می افتد، آں جائز است وایں را غیر شاعر نمی داند و ترکیبے کہ نامانوس ریختہ می باشد، آں معیوب است و دانستن ایں نیز موقوف (بر) سلیقۂ شاعری است و مختار فقیر ہم ہمین است (کہ) اگر ترکیب فارسی موافق گفتگوے ریختہ بود، مضائقہ ندارد۔ پنجم ایہام است کہ در شاعران سلف ایں فن رواج داشت۔ اکنوں طبعہا مصروف ایں صنعت کم است مگر بسیار بہ شستگی بستہ شود و معنی ایہام اینست کہ لفظے کہ بر و بنائے بیت بود آں دو معنی داشتہ باشد، یکے قریب و یکے بعید و بعید منظور شاعر باشد و قریب متروک اُو۔ ششم انداز است کہ مااختیار کردہ ایم و آں محیط ہمہ صنعتہا است۔ تجنیس (و) ترصیع (و) تشبیہ (و) صفائے گفتگو (و) فصاحت (و) بلاغت (و) ادابندی (و) خیال وغیرہ۔ ایں ہمہ بادر ضمن ہمیں است و فقیر ہم ازہمیں و تیرہ محظوظم۔ ہر کرا دریں فن طرز خاص است، ایں معنی رامی فہمد، با عوام کار ندارم۔ اینکہ نوشتہ ام برائے یاران من سند است نہ برائے ہر کس زیرا کہ عرصہ سخن وسیع است و از گون چمنستان ظہور آگہم۔ مصرع: ہر گلے را رنگ بوئے دیگر است''۔ ۴۰

میر تقی میر نے اپنے تذکرہ نکات الشعراء کے اس اختتامی پیراگراف میں خود اپنے عہد تک اُردو شاعری کے تدریجی ارتقا کی طرف بلیغ اشارے کر دیے ہیں: حضرت امیر خسرو اور مرزا معز فطرت موسوی خاں کی ریختہ گوئی ___ جس میں کبھی ایک مصرع فارسی اور دوسرا مصرع اُردو اور کبھی آدھا مصرع فارسی اور آدھا مصرع اُردو میں ہوتا تھا ___ سے لے کر ''ایہام گوئی'' اور پھر خود اپنے عہد کے ''انداز'' تک میر نے اُردو شاعری کے اسالیب میں جن تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے، اُردو شاعری کی تاریخ کی تحقیق و تنقید آج بھی اسے بنیادی اہمیت دیتی ہے، میر نے اپنے 'انداز' کی جو توضیح کی ہے یہ اس کے عہد کے دیگر اہم شاعروں مثلاً سودا، درد، یقین، قائم، تاباں، مضمون، میر سوز وغیرہ پر بھی صادق آتی ہے لیکن میر کی بصیرت سے یہ بات بھی مخفی نہیں تھی کہ اس کے عہد میں شاعری کا محض ایک ہی انداز نہیں تھا (اور نہ کسی بھی دور میں ایسا ہوتا ہے) میر اپنے آخری جملے میں دیگر متنوع امکانات کی طرف بھی واضح اشارہ کرتے ہیں اس لئے میر اپنی بات کو محض اپنے حلقے کے دوستوں کے لئے سند قرار دیتے ہیں ہر کسی کے لئے نہیں کیوں کہ انہیں پتہ ہے کہ 'عرصہ سخن وسیع' ہوتا ہے اور 'چمنستانِ ظہور' میں ان گنت امکانات سامنے آتے

Scanned by CamScanner

رہتے ہیں اور پھر یہ مصرع دہراکر کہ ع:

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

میر صاحب شاعری کے دیگر متنوع رنگوں کی دلکشی کا بھی اعتراف کرتے ہیں یوں ہم دیکھتے ہیں کہ میر اپنے متن کو وسعت پذیر رکھتے ہیں اور اُسے سربہ مہر نہیں کرتے میرے کے تذکرے کے پورے متن میں مختلف شعراء کے بارے میں اُن کی مختصر مگر جامع اور بلیغ آراء کا بھی یہی معاملہ ہے، ان کی تنقیدی رائے کسی شاعر کے تخلیقی امکانات کی طرف اشارہ کر کے قاری کو مطالعے کے لئے آزاد چھوڑ دیتی ہے اور وہ خود اپنے علمی، ذہنی، ثقافتی اور عصری تناظر میں زیر مطالعہ معنی کی تفہیم کرسکتا ہے؛ میر جس عہد میں زندہ تھے اس میں کوئی بات طے شدہ اور اٹل ہو ہی نہیں سکتی تھی (اور ایسا کبھی ہوا بھی نہیں اگر چہ کسی معاشرے میں سیاسی وسماجی استحکام کے عرصے میں ایسے واہمے جڑ ضرور پکڑ لیتے ہیں) اس کے عہد مین ہر دم بدلتا سماجی وسیاسی منظرنامہ میر کا اچھا اتالیق ثابت ہوا اور اُسے ایک خاص تاریخی شعور حاصل ہوا جو صرف 'ذکر میر' اور نکات الشعراء ہی میں ظاہر نہیں ہوا میر کے شعری متن میں بھی موجود ہے خواجہ احمد فاروقی نے تذکرہ نکات الشعراء کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد مختلف شعراء کے بارے میں میر کے تنقیدی اور سوانحی تبصروں سے چند اہم نکات اخذ کئے ہیں، وہ تنقید کو ایک سماجی عمل قرار دیتے ہوئے اس تذکرے میں بالواسطہ طور پر ہم عصر معاشرتی زندگی کے بعض اہم نقوش کی موجودگی کا پتہ چلاتے ہیں ان کے خیال کے مطابق:

''۱۔ اس زمانے میں ہندو اور مسلمان میں بڑا اتحاد اور میل جول تھا اور بعض شعرا قیدِ مذہب وملت سے آزاد تھے۔

۲۔ اہلِ قلم اہلِ سیف بھی تھے اور سخن فہمی وشمشیر شناسی میں تضاد نہیں تھا۔

۳۔ درویشی اور شاعری دوش بدوش چلتی تھیں۔

۴۔ زمانے پر ایک انحطاطی رنگ چھایا ہوا تھا اس لئے بعض شعرا ہزل کی طرف مائل تھے۔

۵۔ مشاعرے معاشرت کا جزو بن گئے تھے اور ان کی حیثیت ادبی جلسے کی ہی نہیں تھی، تنقیدی ادارے کی بھی تھی۔

۶۔ سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ فارسی بھی زوال پذیر تھی اور اس کی خاکستر اُردو کے لئے سامان وجود بن گئی تھی''۔۲۲

اُردو شاعری کے اوّلین تذکرے نکات الشعراء میں تاریخی احساس وشعور کے ان ابتدائی نقوش کے پیش نظر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بعد میں جب اُردو تذکرہ نگاری ارتقائی مراحل سے گزر کر محمد حسین آزاد کی 'آب حیات' تک پہنچی تو مغربی نظام نو آبادیات کے کم وبیش ایک صدی کے عرصے میں ہندوستان کئی سماجی، ذہنی اور عملی تبدیلیوں سے آشنا ہو چکا تھا، تذکرہ نگار اپنے مخصوص عہد کے حوالے سے پڑھے لکھے لوگ تھے اور وہ ان تبدیلیوں سے آگہی بھی رکھتے تھے اس لئے شاعری کے بارے میں تذکرہ نگاری کے خود اپنے دور کے روایتی اندازِ فکر کی پاسداری کرنے کے باوجود وہ تذکرے کو ادبی تاریخ کے قریب تر لے آئے، ڈاکٹر معین الدین عقیل اپنے مقالے 'اردو تاریخ نویسی: صورتِ حال اور تقاضے' میں اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ

> ''تاریخ اور تنقید کا باہمی امتزاج اور اشتراک ہمیں ابتداء تذکرہ نگاری ہی نظر آتا ہے جس میں تذکرہ نگاروں کا تنقیدی شعور بھی شامل ہے کہ جس کے زیر اثر وہ شعراء کا کلام منتخب کرتے تھے .... پھر ان میں گاہے گاہے تاریخی شعور بھی نظر آتا ہے'' ۲۳

ڈاکٹر معین الدین عقیل کا کہنا ہے کہ بالکل ابتدائی تذکروں میں بعض تذکرہ نگاروں نے (قائم نے 'مخزنِ نکات' اور میر حسن نے 'تذکرہ شعرائے اُردو' میں) اُردو شاعروں کو متقدمین، متوسطین اور متاخرین جیسے ادوار میں تقسیم کر کے اپنے نیم پختہ سے تاریخی شعور کا اظہار کیا ہے'' ۲۴ آج کے علمی تناظر میں اس دور کے تذکرہ نگاری کے تاریخی شعور کو نیم پختہ قرار دینے کا کتنا جواز ہے یہ ایک الگ بحث کا موضوع ہے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو تذکروں اور اُردو ادب کی تاریخوں پر کام کرنے والے اکثر

Scanned by CamScanner

اہم محققین یہ اقرار کرتے ہیں کہ اُردو شاعری کے زیادہ تر تذکر نگاروں کو گزرتے وقت اور خود اپنے آپ کے تاریخ کے ایک مخصوص عرصے میں ہونے کا ادراک حاصل تھا، میر کے تذکرہ 'نکات الشعراء' اور قیام الدین قائم کے 'مخزن نکات' (۱۱۶۸ھ/۱۷۵۴ء) سے لے کر علی ابراہیم خلیل کے 'گلزار ابراہیم' (۱۱۹۸ھ/۱۷۸۳ء) مرزا علی لطف کے 'گلشن ہند' (۱۸۰۰-۰۱ء) مصطفیٰ خاں شیفتہ کے 'گلشن بے خار' (۱۸۳۲-۳۵ء) کریم الدین اور فعلن کے 'طبقات شعرائے ہند (۱۸۴۶/۴۷ء) قادر بخش صابر کے 'گلستانِ سخن (۱۸۵۴-۵۵ء) ڈرگا پرشاد نادر کے خزینۃ العلوم (۱۸۷۱-۷۲ء) اور مختلف محققین کے خیال میں تذکرہ نگاری ۱۳ اور تاریخ ادب کی درمیانی کڑی ۲۵ محمد حسین آزاد کی 'آبِ حیات' تک اُردو شاعری کے عصری ماحول اور گزرتے وقت کے ساتھ اس میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کو تفہیم کے متنوع انداز ملتے ہیں، اس دوران ان میں 'انگریزی لالٹینوں کی روشنی' میں خود اپنی روایت ادب کے کئی ایسے گوشے منور ہو کر سامنے آنے لگے جن کی طرف پہلے توجہ نہیں گئی تھی اس لئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری اُردو شاعری کے قدیم و جدید تذکروں کے گہرے مطالعے کے بعد یہ رائے ظاہر کرتے ہیں کہ

> ''شمیم سخن اور آبِ حیات میں تذکرہ نگاری براہ راست تاریخ کی سرحدوں میں داخل ہو جاتی ہے، ان میں ہمیں وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو کسی قدیم ادبی تاریخ سے توقع کی جا سکتی ہے'' ۲۶

ڈاکٹر معین الدین عقیل اُردو تذکروں کی روایت کے تناظر میں 'آب حیات' میں

> ''.....شعراء کے تذکرے کے ساتھ ساتھ لسانی تحقیق، ادبی تنقید اور تاریخ اور سوانح نگاری کے ابتدائی نمونے بھی ملتے ہیں، اسی بنا پر یہی ہماری تاریخ نویسی کا آغاز ہے اور تنقیدی شعور اور تحقیق و جستجو کے باعث اب تذکرہ نگاری تاریخ نویسی میں ضم ہو جاتی ہے؛ یوں تذکرے اب بھی لکھے جاتے ہیں اور اس طرح یہ روایت یکسر ختم تو نہیں ہوتی لیکن نوعیت اور مقصد اب مختلف ہے اور اہمیت تاریخ نویسی کو حاصل ہے'' ۲۷

اُردو شاعری کے تذکروں اور 'آبِ حیات' کے بارے میں معتبر محققین کی ان آراء کے باوجود یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ نہ تو یہ تذکرے اور نہ ہی 'آب حیات' اُردو ادب کی مربوط تاریخ پیش کرتے ہیں ایک خاص حد تک تاریخی شعور کا حامل ہونا اور بات ہے اور تاریخ نویسی کا فن ایک اور چیز ہے جس کے اپنے تقاضے ہیں، قدیم تذکرہ نگار تاریخ کے شعور کے حامل ہوں تب بھی ہم ادبی تاریخ کے جدید اور جدید تر اصولوں کا تقاضا ان سے اس لئے نہیں کر سکتے کہ تذکرہ نگار تذکرہ اور طبقات کو تاریخ کی شاخیں سمجھتے بھی تھے تو وہ کوئی پیشہ ور تاریخ دان نہیں تھے، علاوہ ازیں ان کے سامنے قدیم فارسی تذکرہ نگاری کی جو روایت موجود تھی اس کے انداز کی تقلید بھی ان کی مجبوری تھی۔

Scanned by CamScanner

حوالہ جات

۱۔ ابن حنیف: مرزا ابن حنیف کی کتب 'دنیا کا قدیم ترین ادب' (۱۹) مطبوعہ بیکن بکس، ملتان اور 'مصر کا قدیم ترین ادب (۱۹) مطبوعہ بیکن بکس، ملتان میں قبل از تاریخ کی ادبی روایات کو بڑی محنت سے یکجا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۲۔ بحوالہ فرمان فتح پوری ڈاکٹر (۱۹۶۸ء)، نگار، پاکستان سالنامہ مئی، جون ۱۹۶۸ء تذکروں کا تذکرہ نمبر ص ۲

۳۔ فرمان فتح پوری ڈاکٹر (۱۹۷۳ء) بحوالہ اُردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، ۱۹۷۲ مجلس ترقی ادب لاہور ص ۱۸

۴۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر (۱۹۶۸ء) شعرائے اُردو کے تذکرے طبع ثانی مکتبہ خیابان لاہور ص ۱۳

۵۔ کلیم الدین احمد (۱۹۶۵ء) اُردو تنقید پر ایک نظر، لاہور ص ۲۵

۶۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر (۱۹۶۸ء) شعرائے اُردو کے تذکرے طبع ثانی مکتبہ خیابان لاہور ص ۹، ۱۰

۷۔ فرمان فتح پوری ڈاکٹر (۱۹۷۲ء) بحوالہ سابقہ تلخیص ص ۳۱ تا ص ۴۴ مجلس ترقی ادب لاہور

۸۔ فرمان فتح پوری ڈاکٹر (۱۹۷۲ء) بحوالہ سابقہ ص ۱۲

۹۔ کریم الدین، مولوی مولفہ طبقاتِ شعرائے ہند مطبع العلوم دہلی ۱۸۴۸ء بحوالہ فرمان فتح پوری بحوالہ سابقہ ص ۳۶۱

۱۰۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر (۱۹۷۲ء) بحوالہ سابقہ ص ۶۷

۱۱۔ محمد نواب کریم، سید (۱۹۹۳ء) ''اردو تنقید حالی سے کلیم تک''، تخلیق کا پبلشرز دریا گنج نئی دہلی ص ۴۵

۱۲۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر (۱۹۶۸ء) بحوالہ سابقہ ص ۶۰

۱۳۔ فرمان فتح پوری ڈاکٹر (۱۹۸۲ء) (برائے تفصیل) (۱۹۷۲ء) بحوالہ سابقہ ص ۳۰۷، ۳۰۸

۱۴۔ جیمیسن، فریڈرک (۱۹۸۱ء) 'The Political Unconsious' Routledge London ص ۱۴۱

۱۵۔ جیمیسن، فریڈرک (۱۹۸۱ء) ایضاً ص ۱۴۱، ۱۴۲

۱۶۔ سید عبداللہ، ڈاکٹر (۱۹۶۸ء) بحوالہ سابقہ ص ۶۶

۱۷۔ محمود الٰہی ڈاکٹر (مرتب) مقدمہ تذکرہ 'نکات الشعراء' (جنوری ۱۹۷۲) دانش محل لکھنو ص ۱۵

۱۸۔ میر، محمد تقی، تذکرہ نکات الشعراء مرتبہ ڈاکٹر محمود الٰہی بحوالہ سابقہ ص ۲۳

۱۹۔ میر، محمد تقی بحوالہ سابقہ ص ۲۳

۲۰۔ میر، محمد تقی بحوالہ سابقہ ص ۹۱

۲۱۔ میر، محمد تقی بحوالہ سابقہ ص ۶۴، ۱۶۳

۲۲۔ احمد فاروقی، خواجہ (۱۹۵۴ء) ''میر تقی میر: حیات اور شاعری'' ص ۵۲۹، ۵۳۰ بحوالہ ڈاکٹر فرمان فتح پوری (۱۹۷۲ء) بحوالہ سابقہ ص ۹۲

۲۳۔ عقیل، ڈاکٹر معین الدین، مقالہ ''اُردو تاریخ نویسی؛ صورتِ حال اور تقاضے'' پیش کردہ اور روزہ سیمینار 'تاریخِ ادب کی تدریس اور ادبی تاریخ نویسی'' (۸، ۹ جون ۲۰۰۷ء) زیر اہتمام شعبہ اُردو یونیورسٹی آف سرگودھا، قلمی مسودہ ص ۱

۲۴۔ عقیل، ڈاکٹر معین الدین بحوالہ سابقہ ص ۲

۲۵۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنی تحقیقی تصنیف 'اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری' (ص ۶۱۰، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۲۴) اور ڈاکٹر معین الدین عقیل نے اپنے محولہ بالا مقالے میں دلائل سے یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اُردو شاعری کے قدیم تذکروں اور آبِ حیات میں نہ صرف اُردو ادب کی قدیم تاریخ کے لئے وافر اور مصدقہ مواد موجود ہے بلکہ ان میں ایک مخصوص انداز کا تاریخی شعور بھی موجود ہے خصوصاً آبِ حیات ادبی تاریخ نگاری کی طرف ایک اہم قدم ہے۔

۲۶۔ فرمان فتح پوری، ڈاکٹر (۱۹۷۲ء) بحوالہ سابقہ ص ۹۱

۲۷۔ عقیل، ڈاکٹر معین الدین بحوالہ سابقہ ص ۷س

Scanned by CamScanner